accountabilitylab
PAKISTAN

پالیسی رپورٹ

عمرانی معاہدے کی تجدید:
ریاستِ پاکستان اور شہریوں کے مابین اعتماد سازی

/accountlabpk

pakistan.accountabilitylab.org

فہرست

جامع خُلاصہ 3

تعارف 4

پاکستان میں ریاست اور شہریوں کے درمیان بداعتمادی کی بنیادی وجوہات 5

اعتماد کے فقدان کے خاتمے کی موجودہ کوششیں 6

بین الاقوامی تجربات سے حاصل ہونے والے سبق 7

پاکستان میں نئے عمرانی معاہدے کی تشکیل: اصلاحات کے لیے روڈمیپ 8

وسائل کی تقسیم پر نظرثانی 8

سیاسی طاقت کی تقسیم 8

انتخابی نظام میں اصلاحات 8

دیگر اہم اصلاحاتی شعبے 9

عدالتی اصلاحات 9

مقامی حکومتوں کو اختیار دینا 9

شہریوں کی شمولیت اور شرکت کو بڑھانا 9

جامع خُلاصہ

سیاسی فلسفے کے بنیادی ستون عمرانی معاہدے کا تصور، حکومت اور افراد کے درمیان باہمی ذمہ داریوں کی وضاحت کرتا ہے۔ یہ تصور قدیم یونانی فلسفے سے شروع ہوا اور بعد میں تھامس ہابز، جان لاک، اور ژاں ژاک روسو جیسے مفکرین نے اسے مزید فروغ دیا۔ اس معاہدے میں افراد اپنی کچھ آزادیاں ایک ریاست کے حوالے کر دیتے ہیں تاکہ بدلے میں تحفظ اور سماجی نظم وضبط حاصل کیا جا سکے۔ پاکستان میں، یہ عمرانی معاہدہ 1947 میں ملک کی آزادی کے بعد سے مسلسل تبدیل ہوتا رہا ہے، جو آئینی اصلاحات، فوجی مداخلتوں، اور معاشی وسماجی تبدیلیوں سے تشکیل پایا ہے۔ تاہم، ریاست اور اس کے شہریوں کے درمیان مسلسل بداعتمادی، جوامتیازی طرز حکمرانی، مرکزی کنٹرول، اور آئینی اصلاحات میں تاخیر سے پیدا ہوئی ہے، نے اس معاہدے کو کمزور کر دیا ہے۔

یہ پالیسی بریف پاکستان میں ارتقائی عمرانی معاہدے کا جائزہ فراہم کرتا ہے اور اس کے تاریخی ارتقاء، موجودہ چیلنجز، اور اصلاح کے ممکنہ طریقوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس تجزیے میں ان مرکزی عوامل کا احاطہ کیا گیا ہے جو ریاست اور اس کے شہریوں کے درمیان بڑھتی ہوئی بداعتمادی کا باعث بنے ہیں۔ ان عوامل میں مرکزی حکومت کا اثر ورسوخ، امتیازی اقدامات جو مخصوص طبقات کو نظرانداز کرتے ہیں، دیرینہ صوبائی تنازعات، اور سلامتی پر مرکوز ذہنیت شامل ہیں۔ ان عوامل نے حکومت اور عوام کے درمیان تعلقات کو خراب کرنے کے ساتھ ساتھ ایک ایسے نظام بھی کو جنم دیا ہے جس میں اعتماد اور رضاکارانہ تعاون کمزور ہوتا جا رہا ہے۔

پالیسی بریف میں عالمی مثالوں سے سیکھنے کے مواقع پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، جیسے کہ پوسٹ اپارتھائیڈ جنوبی افریقہ، جہاں مکالمے اور فیصلہ سازی میں عوامی شمولیت پر مبنی پالیسیوں نے ایک گہری منقسم قوم کو جوڑنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ روانڈا کی نسل کشی کے بعد کی کوششیں انصاف اور مفاہمت کی اہمیت کو اجاگر کرتی ہیں کہ کس طرح ٹوٹے ہوئے معاشروں کی بحالی ممکن ہوتی ہے۔ جنوبی کوریا کی فوجی حکومت سے ایک ترقی پذیر جمہوریت کی طرف منتقلی ایک اور اہم مثال ہے، جو یہ ظاہر کرتی ہے کہ اسٹریٹجک اصلاحات اور وسیع تر سیاسی شمولیت ترقی اور اعتماد کو فروغ دے سکتی ہیں۔ اس کے برعکس، اس پالیسی بریف میں وینزویلا، زمبابوے، اور کئی عرب ممالک میں عمرانی معاہدے کی بحالی کی کوششوں میں ناکامیوں کا بھی احاطہ کیا گیا ہے، جہاں غیر موثر اصلاحات، شدید بدعنوانی، اور سیاسی عدم استحکام نے بداعتمادی کو مزید بڑھاوا دیا اور عمرانی معاہدے کو مزید خراب کیا۔

یہ پالیسی بریف پاکستان کے عمرانی معاہدے کو نئے سرے سے تشکیل دینے کے لیے ایک تفصیلی روڈ میپ کا خاکہ پیش کرتا ہے۔ اس میں صوبائی عدم توازن کو دور کرنے اور مساوی نمائندگی کو یقینی بنانے کے لیے وسائل کی تقسیم اور سیاسی طاقت کی شراکت کے طریقہ کار کا جائزہ لینے کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔ انتخابی اور عدالتی نظام کی اصلاحات کو ترجیح کے طور پر اجاگر کیا گیا ہے، جس کا مقصد انصاف کی فراہمی میں شفافیت اور رسائی کو بہتر بنانا ہے۔ مزید برآں، سول سروس اور مقامی حکومتوں کے ذریعے اصلاحات کو نچلی سطح پر حکمرانی کو بہتر بنانے کے لیے ضروری قرار دیا گیا ہے، تاکہ فیصلہ سازی شہریوں کی ضروریات کے مطابق زیادہ جوابدہ ہو۔

تجویز کردہ روڈ میپ کا ایک اہم پہلو سیاسی عمل میں شہریوں کی شمولیت کا فروغ ہے۔ زیادہ شرکت اور آراء کے لیے مزید چینلز بنا کر، ریاست عوام میں ملکیت کا زیادہ احساس پیدا کر سکتی ہے۔ پالیسی بریف میں آئینی اور پالیسی اصلاحات کے ساتھ ساتھ حکمرانی میں شفافیت، جوابدہی اور شمولیت کے فروغ کی بھی بات کی گئی ہے۔ یہ سب مل کر اعتماد کی بحالی اور زیادہ شراکت دارانہ سیاسی ماحول کو پروان چڑھانے کے لیے ضروری ہیں۔

تعارف

ریاست اور شہریوں کے مابین عمرانی معاہدے کی تجدید محض ایک واقعہ نہیں بلکہ یہ ایک طویل مدتی عمل ہے۔ یہ عمل بات چیت، وقوع پذیر ہونے والی تبدیلیوں اور ریاست اور شہریوں کے مابین تعلقات کے ارتقاء کے ذریعے جاری رہتا ہے۔ جیسے جیسے متحرک معاشرے آگے کی طرف بڑھتے ہیں، شرائط کو نئے چیلنجز اور حقائق کے ساتھ دوبارہ جانچنا اور معاہدے کی تجدید کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ لوگوں کی توقعات اور ضروریات میں تبدیلی کی وجہ سے، عمرانی معاہدہ آئینی اصلاحات، قانون سازی میں ترامیم، پالیسیوں میں بہتری اور حکومتی طریقوں کے بدلنے کے ساتھ ساتھ اپنی جہت بدلتا رہتا ہے۔

برطانیہ کے زیرِ تسلط ہندوستان کے عمرانی معاہدے سے پیدا ہونے والے سخت رد عمل اور برطانوی دور کے بعد اس کی ممکنہ نوعیت نے برصغیر میں مسلم اشرافیہ کے درمیان ایک غیر اعلانیہ معاہدے کو جنم دیا کہ انہیں ایک خود مختار حکومت کی ضرورت ہے۔ یہ معاہدہ پھر ایک ایسی آزاد ریاست کے قیام کا باعث بنا جس میں مسلمان اکثریتی علاقے شامل تھے۔ جب سے پاکستان 1947 میں وجود میں آیا ہے، ملک میں عمرانی معاہدہ مختلف مراحل بشمول آئینی تبدیلیوں یا ضروری ترامیم، فوجی مداخلتوں کے واقعات، جمہوری اصلاحات، اور سماجی و اقتصادی تبدیلیوں سے گزرتا رہا ہے۔ ان میں سے ہر ایک مرحلہ عمرانی معاہدہ کی شرائط کو دوبارہ طے کرنے کے عمل کا ایک حصہ رہا ہے۔ گزشتہ ساڑھے سات دہائیوں میں شہریوں اور ریاست نے اپنے اپنے حق میں ان شرائط کو دوبارہ ترتیب دینے کی کوشش کی ہے۔ ان کوششوں میں سے کچھ نے معاہدے کو مضبوط کیا، جبکہ دیگر نے شہریوں اور ریاست کے درمیان بداعتمادی کی فضا پیدا کی۔

یہ سفر، جو کہ ثقافتی طور پر مختلف ذیلی قومیتوں، معاشی طبقات، اور مذہبی اختلافات کے درمیان مختلف مفادات میں توازن پیدا کرنے کی کوشش ہے، اکثر آئینی مداخلتوں، سیکورٹی خدشات، فوجی بغاوتوں اور نوآبادیاتی دور کے اثرات کے تحت چلنے والے طرز حکمرانی سے متاثر ہوا۔ دوسری طرف، صوبوں کو زیادہ اختیارات دے کر غیر مرکزی نظام کی کوششوں، پسماندہ طبقوں کو مرکزی دھارے میں لانے، اور جمہوری تسلسل پر سیاسی اتفاقِ رائے سے شہریوں اور ریاست کے درمیان اعتماد بحال کرنے کی کوشش کی گئی۔

پاکستان میں عمرانی معاہدے کی موجودہ حالت کو نازک تصور کیا جاتا ہے، جہاں حکومت اور عوام کے درمیان اعتماد کی خلیج گہری ہو رہی ہے۔ شہری اکثر ریاست کو ایک ایسی ہستی کے طور پر دیکھتے ہیں جو اشرافیہ کے مفادات کی حفاظت اور اپنے کنٹرول کو برقرار رکھنے میں زیادہ دلچسپی رکھتی ہے، بجائے اس کے کہ وہ عوام کو خدمات، انصاف اور ترقی کے مواقع فراہم کرے۔ یہ اعتماد کی کمی عوام کو ریاستی احکامات، ہدایات، اور فرمانوں کی رضاکارانہ پیروی سے روکتی ہے، جس کے نتیجے میں ریاست اپنی رٹ قائم کرنے کے لیے مزید جبری طریقے اختیار کرتی ہے۔ پاکستان کی یہ مخصوص صورتحال خان اور دیگر (2021)، ایس میگوائر (2019)، اور لال (2012) کی تحقیقی دستاویزات میں اچھی طرح بیان کی گئی ہے۔

اس پالیسی بریف میں موجودہ تحقیق کو آگے بڑھاتے ہوئے، پاکستان میں ریاست اور شہریوں کے درمیان عدم اعتماد کی بنیادی وجوہات، اعتماد کے خلا کو پُر کرنے کی گزشتہ کوششوں کا جائزہ، اور عمرانی معاہدے کو دوبارہ ترتیب دینے کے لیے دنیا بھر کی کامیاب اور ناکام مثالوں کا جائزہ لیا گیا ہے، اس کے علاوہ، پاکستانی شہریوں کے نقطہ نظر سے عمرانی معاہدہ کو دوبارہ ترتیب دینے کے طریقے بھی تجویز کیے گئے ہیں۔

عمرانی معاہدے کے نظریے کا ارتقاء۔ تاریخ کے آئینے میں:

عمرانی معاہدے کا نظریہ سیاسی فلسفے میں ایک بنیادی تصور ہے۔ انسائیکلوپیڈیا بریٹینیکا کے مطابق، عمرانی معاہدہ معاشرے کے اراکین، خاص طور پر افراد اور حکومت کے درمیان ایک باہمی معاہدہ ہوتا ہے جہاں افراد اپنے باقی ماندہ حقوق کے تحفظ اور سماجی نظم و ضبط کو برقرار رکھنے کے لیے اپنی کچھ آزادیوں سے دستبردار ہونے اور حکومت کی اتھارٹی کو قبول کرنے پر رضامند ہوتے ہیں۔

اس نظریے کی جڑیں قدیم یونانی فلسفے میں ہیں، لیکن جدید دور کے ابتدائی فلسفیوں، جیسے تھامس ہابز (1588–1679)، جان لاک (1632–1704)، اور جین جیک روسو (1712–1778) نے اسے ایک باقاعدہ سیاسی نظریے کے طور پر فروغ دیا۔ ہابز نے اپنی مشہور تصنیف "لیویتھن" (1651) میں دلیل دی کہ "فطری حالت" میں انسان اپنی خود غرضانہ جبلتوں کی وجہ سے مسلسل تصادم میں مبتلا رہتا ہے۔ اس وحشیانہ حالت سے بچنے کے لیے، افراد ایک اجتماعی معاہدے کے ذریعے ایک ایسا معاشرہ تشکیل دینے پر متفق ہوتے ہیں جس پر ایک خود مختار اتھارٹی حکمرانی کرتی ہو، جو امن اور نظم برقرار رکھنے کا مکمل اختیار رکھتی ہو۔

ہابز کے کام کو آگے بڑھاتے ہوئے، لاک نے استدلال کیا کہ انسان کی فطری حالت اتنی افراتفری میں نہیں تھی جتنا کہ ہابز نے بیان کیا تھا، بلکہ یہ قانونِ فطرت کے تحت تھی۔ لوگوں نے بنیادی طور پر اپنے فطری حقوق، زندگی، آزادی، اور ملکیت کے تحفظ کے لیے ایک حکومت تشکیل دینے کے معاہدے میں شمولیت اختیار کی۔

روسو نے اپنی تصنیف "سوشل کنٹریکٹ" (1762) میں دلیل دی کہ افراد صرف اس وقت حقیقی آزادی حاصل کر سکتے ہیں جب وہ ان قوانین کی تشکیل میں حصہ لیں جن کے وہ تابع ہوں۔

پاکستان میں ریاست اور شہریوں کے درمیان بداعتمادی کی بنیادی وجوہات

پاکستان کی نوآبادیاتی وراثت ان اہم عوامل میں شامل تھی جنہوں نے ملک کے ابتدائی سالوں میں ریاست اور شہریوں کے تعلقات کو شکل دی۔ مورخین جیسے عائشہ جلال اور خالد بن سعید نے برطانوی نوآبادیاتی دور کے تحت حکومتی ڈھانچے کو انتہائی مرکزی اور آمرانہ قرار دیا ہے، جو زیادہ تر افسر شاہی اور اشرافیہ پر انحصار کرتا تھا۔ اس ڈھانچے کا مقصد جمہوری حکمرانی کو فروغ دینا یا مقامی ضروریات کو پورا کرنا نہیں بلکہ عوام پر کنٹرول برقرار رکھنا اور وسائل قبضے میں لینا تھا۔ پاکستان نے 1947 میں اس حکومتی ڈھانچے کو وراثت میں پایا، جو کہ ایک نئے ڈھانچے پر اتفاق رائے کی عدم موجودگی میں ملک کی حکومتی سرگرمیوں پر حاوی رہا۔

مرکزی حکومت کے ذریعے امور چلانے کے ان طریقوں کے تسلسل نے ایک جامع اور شرکت پسندانہ سیاسی نظام کی تشکیل کی کوششوں کو متاثر کیا۔ ریاستی نظام نے شہریوں کو حکمرانی کے عمل میں سرگرم شرکاء کے بجائے ایسے افراد کے طور پر دیکھا جو کہ حکومت کے تابع ہوں۔ جوابدہی اور ذمہ داری کے فقدان نے مختلف نسلی اور علاقائی گروہوں میں علیحدگی کے احساس کو جنم دیا، جو کہ فیصلہ سازی کے عمل سے خود کو خارج شدہ محسوس کرتے تھے۔

برطانوی ہندوستان میں نوآبادیاتی پالیسیوں نے "تقسیم کرو اور حکومت کرو" جیسے طریقوں کے ذریعے نسلی، مذہبی اور علاقائی اختلافات کو مزید بڑھایا۔ ان پالیسیوں نے مختلف نسلی اور علاقائی گروہوں کے درمیان بداعتمادی اور رقابت کی ایک وراثت چھوڑی، جو پاکستان میں آزادی کے بعد بھی جاری رہی۔ آزادی کے محض چند دن بعد، اگست 1947 میں، مرکزی حکومت نے ایک قانونی چال کے ذریعے اُس وقت کے صوبہ سرحد (این ڈبلیو ایف پی) کی صوبائی حکومت کو برخاست کر دیا، جس کی قیادت ڈاکٹر خان صاحب (خان عبدالجبار خان) کر رہے تھے، جو اس وقت مسلم لیگ کی حریف کانگریس کی نمائندگی کرتے تھے۔ ڈاکٹر خان صاحب اور ان کے بھائی باچا خان کے حامی اور ہمدرد پاکستانی ریاست کے بارے میں ہمیشہ شک و شبہات کا شکار رہے۔ پاکستان کی وفاقی حکومت نے 1948 میں بلوچستان میں فوج بھی بھیجی تاکہ ریاست قلات کو پاکستان میں ضم کیا جا سکے۔

مشرقی اور مغربی پاکستان کے مابین کشیدگی شروع سے ہی آئین سازی کے عمل میں ظاہر ہوئی۔ مشرقی پاکستان کا رقبہ نئے ملک کے کل رقبے کا صرف پانچواں حصہ تھا لیکن اس میں نصف سے زائد آبادی رہتی تھی۔ ملک بننے کے فوراً بعد مختلف نسلی اور سیاسی تضادات بھی ابھرے۔ مختلف گروہوں کے درمیان اس محرومی اور امتیازی سلوک کے احساس نے ریاست اور شہریوں کے تعلقات کو بگاڑنے میں اہم کردار ادا کیا اور یہ وجوہات بالآخر 1971 میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی اور بنگلہ دیش کے قیام کا باعث بنیں۔ پاکستان کے ابتدائی سالوں میں ریاست کا کنٹرول برقرار رکھنے اور اختلاف رائے کو دبانے کے لیے جابرانہ اقدامات کا استعمال شہریوں کو مزید الگ تھلگ کرتا گیا۔ ہنگامی قوانین کے نفاذ، سیاسی آزادیوں پر پابندی، اور مخالف سیاسی آوازوں کے خلاف کریک ڈاؤن نے ریاست کو جابرانہ اور شہریوں کی ضروریات اور حقوق سے بے پرواہ کے طور پر تصور کیا۔ اس طریقہ کار نے ریاست اور عوام کے درمیان ایک بھروسے مند اور باہمی تعلق کی تعمیر کی کوششوں کو کمزور کیا (جلال، 1995)۔

پاکستان کے ابتدائی سالوں میں ریاست کا کنٹرول برقرار رکھنے اور اختلاف رائے کو دبانے کے لیے جابرانہ اقدامات کا استعمال شہریوں کو مزید الگ تھلگ کرتا گیا۔ ہنگامی قوانین کے نفاذ، سیاسی آزادیوں پر پابندی، اور مخالف سیاسی آوازوں کے خلاف کریک ڈاؤن نے ریاست کو جابرانہ اور شہریوں کی ضروریات اور حقوق سے بے پرواہ کے طور پر تصور کیا۔ اس طریقہ کار نے ریاست اور عوام کے درمیان ایک بھروسے مند اور باہمی تعلق کی تعمیر کی کوششوں کو کمزور کیا (جلال، 1995)۔

برطانوی نوآبادیاتی انتظامیہ نے ریاست پر اپنا کنٹرول برقرار رکھنے اور محصولات جمع کرنے کے لیے زمینیں تقسیم کر کے اور چند افراد کو خطابات سے نواز کر جاگیردار اشرافیہ تشکیل دی تھی۔ قیامِ پاکستان کے بعد بھی یہ جاگیردارانہ ڈھانچے، غیر مؤثر زرعی اصلاحات کی وجہ سے بڑی حد تک برقرار رہے۔۔ زمین اور طاقت کا اشرافیہ کے ہاتھوں میں ارتکاز سماجی و اقتصادی عدم مساوات میں اضافہ کرتا رہا۔ اس سب کے علاوہ، اعتماد کے اس خلا کی ایک اہم وجہ آئین سازی کو جدید تقاضوں کے مطابق ڈھالنے میں تاخیر اور عدم تسلسل رہی ہے۔ آزادی کے بعد تقریباً ایک دہائی تک، پاکستان اپنے آئین سے محروم تھا اور نوآبادیاتی آئین "گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935" پر انحصار کرتا رہا۔ دو قانون ساز اسمبلیوں کی مسلسل کوششیں بھی اتفاق رائے تک پہنچنے میں ناکام رہیں۔ پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی (1947-1954) کو تیسرے گورنر جنرل غلام محمد نے تحلیل کر دیا تھا۔ دوسری دستور ساز اسمبلی (1955-1958) نے 1956 میں ایک آئین منظور کیا لیکن دو سال بعد ہی اسے اس کے ڈھانچے میں پائے جانے والے تضادات کی وجہ سے معطل کر دیا گیا۔

آئین تیار کرنے میں اس غیر معمولی تاخیر کی ایک بڑی وجہ صوبوں کے درمیان اختیارات کی تقسیم تھی، جس میں بنگال صوبہ کی آبادی مغربی پاکستان کے تمام چار صوبوں کی مجموعی آبادی سے زیادہ تھی۔ نام نہاد "برابری کا اصول" وضع کیا گیا اور 1956 کے آئین میں مغربی پاکستان کو ایک صوبے کے طور پر دیکھتے ہوئے ایک وحدانی طرز حکومت فراہم کیا گیا۔ اس سے تین مغربی صوبوں اور ان ریاستوں میں غصے کی لہر دیکھنے میں آئی جو ون یونٹ کا حصہ بنی تھیں۔ یہ آئین جنرل ایوب خان کے مارشل لا کے تحت 1962 میں ایک نئے آئین سے تبدیل کیا گیا، جس نے صدارتی طرز حکومت فراہم کیا۔ 1962 کا آئین بھی علاقائی اور صوبائی کشیدگی کو کم کرنے میں ناکام رہا۔ مرکزی حکومت اور صوبائی حکومتوں کے درمیان اختیارات کی تقسیم کے لیے ایک آئین کی عدم موجودگی میں علاقائی خود مختاری اور وسائل کی تقسیم کے معاملات پر الجھن اور تنازعات پیدا ہو گئے۔ اس تاخیر نے ایک خلا پیدا کیا اور بالآخر نوآبادیاتی دور کی افسر شاہی اور فوجی اداروں کو مضبوط کیا۔ عدلیہ، پولیس اور مقامی حکومتوں جیسے اداروں کی کمزور ترقی کا مطلب یہ تھا کہ یہ ادارے اکثر کنٹرول اور سرپرستی کے نوآبادیاتی دور کے طریقوں کی عکاسی کرتے ہوئے کام کرتے تھے، بجائے اس کے کہ وہ جمہوری جوابدہی کے اصولوں پر عمل کریں۔

عدلیہ، پولیس اور مقامی حکومتوں جیسے اداروں کی کمزور ترقی کا مطلب یہ تھا کہ یہ ادارے اکثر کنٹرول اور سرپرستی کے نوآبادیاتی دور کے طریقوں کی عکاسی کرتے ہوئے کام کرتے تھے، بجائے اس کے کہ وہ جمہوری جوابدہی کے اصولوں پر عمل کریں۔

وسائل اور خود مختاری کے حوالے سے صوبائی تنازعات نے بھی ریاست اور شہریوں کے درمیان بداعتمادی کو ہوا دی۔ زرعی مقاصد، قدرتی دریائی بہاؤ، اور روزمرہ کے استعمال کے کے لیے پانی کی تقسیم ایک متنازعہ مسئلہ رہا ہے۔ 1991 میں صوبوں نے پانی کی تقسیم کے لیے "واٹر اپورشنمنٹ ایکارڈ" پر اتفاق کیا اور دریائے سندھ کے پانی کے بہاؤ کو ہر صوبے تک پہنچانے کے لیے "انڈس ریور سسٹم اتھارٹی" (IRSA) قائم کی۔ سندھ صوبہ اب بھی خشک سالی کے اوقات میں یا جب بالائی صوبوں میں پانی کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے، اپنے حصے کا پانی نہ ملنے کی شکایت کرتا ہے۔ ڈیموں اور بیراجوں کی تعمیر پر تنازعات، خاص طور پر کالا باغ ڈیم، آج تک سر اٹھائے ہوئے ہیں۔

بلوچستان، جو قدرتی گیس کے ذخائر سے مالا مال ہے، وسائل سے حاصل ہونے والے فوائد کی تقسیم اور محصولات کے انتظامات کے حوالے سے عدم اطمینان کا اظہار کرتا رہتا ہے۔ بلوچستان کا مؤقف ہے کہ اسے اس کے وسائل سے حاصل ہونے والے فوائد کا منصفانہ حصہ نہیں ملتا۔ دیگر صوبے، خاص طور پر خیبر پختونخواہ بھی گیس کی فراہمی اور تقسیم کے حوالے سے خدشات رکھتا ہے۔ صوبے محصولات کی تقسیم کے طریقہ کار کے حوالے سے بھی خدشات ظاہر کرتے ہیں۔ "نیشنل فنانس کمیشن ایوارڈ" کو ان مسائل کو حل کرنے کے لیے ڈیزائن کیا گیا تھا تاکہ وفاقی محصولات کی صوبوں کے درمیان تقسیم کا تعین کیا جا سکے، لیکن اس کا باقاعدگی سے جائزہ نہ لینے کی وجہ سے بلوچستان اور سندھ جیسے صوبوں نے شکایات کا اظہار کیا کہ انہیں ان کا جائز حصہ نہیں مل رہا۔ بڑے پیمانے پر ترقیاتی منصوبوں، جیسے مواصلاتی ڈھانچے کی غیر متناسب الاٹمنٹ بھی متنازعہ رہا ہے۔

برطانیہ کے تسلط سے آزاد ہونے کے بعد سرحدی تنازعات نے ریاستِ پاکستان میں ابتدا سے ہی سیکورٹی کے شدید خدشات کو جنم دیا۔ آزادی کے فوراً بعد کشمیر پر بھارت کے ساتھ شروع ہونے والے تنازعے نے ان خدشات کو مزید بڑھا دیا۔ سرد جنگ کے دوران، پاکستان کی امریکہ کے ساتھ صف بندی اور خاص طور پر افغانستان میں علاقائی تنازعات، نے بھی سیکورٹی کے خدشات میں اضافہ کیا۔ 1979 میں افغانستان پر سوویت یونین کے حملے کے بعد، پاکستان سوویت توسیع کے خلاف امریکی قیادت میں کی جانے والی کوششوں میں فرنٹ لائن ریاست بن گیا۔ اس کے نتیجے میں، پاکستان کی فوج نے سیکورٹی کے اس عذر کا استعمال متعدد فوجی بغاوتوں اور مارشل لاء کے جواز کے طور پر بھی کیا۔ تمام بغاوتیں بشمول 1958، 1969، 1977، اور 1999 قومی سلامتی اور سیاسی عدم استحکام کی بہانوں کی بنیاد پر کی گئیں۔ ان فوجی مداخلتوں نے سیاسی سرگرمیوں میں رکاوٹیں پیدا کی اور بنیادی حقوق معطل کر دیے گئے، جس سے ریاست اور شہریوں کے تعلقات پر منفی اثرات مرتب ہوئے۔ بلوچستان میں جاری بغاوت اور دہشت گردی کے خطرے سے نمٹنے کے حوالے سے سیاسی اور سماجی اختلافات موجود ہیں، جن سے ریاست روایتی سیکورٹی پر مبنی نقطہ نظر کے ذریعے نمٹنے کی کوشش کر رہی ہے۔

اس کے علاوہ، سماجی و اقتصادی عدم مساوات، نظام میں موجود بدعنوانی، اور قانون کی حکمرانی کی کمزوریوں نے ان مسائل کو مزید پیچیدہ کر دیا ہے، جس سے یہ تاثر پیدا ہوا کہ ریاست عام شہریوں کی ضروریات کو پورا کرنے کے بجائے اشرافیہ کے مفادات کو برقرار رکھنے میں زیادہ دلچسپی رکھتی ہے۔ یہ تاثر خاص طور پر ان علاقوں میں زیادہ نمایاں ہے جہاں ریاست کی طرف سے نظر انداز کرنے یا جبر کی تاریخ موجود ہے، جیسے سابقہ وفاق کے زیر انتظام قبائلی علاقے (فاٹا) اور گلگت بلتستان کے کچھ حصے، جہاں ریاست کی موجودگی اکثر خدمات فراہم کرنے کے بجائے جبر کے مترادف سمجھی جاتی ہے۔ کچھ دیگر پیچیدہ تنازعات بھی موجود ہیں۔ مثال کے طور پر، مشرقی اور وسطی پنجاب کے کسانوں کو نہری کالونیوں اور جنوبی پنجاب اور سندھ کے علاقوں میں زرعی زمین کی الاٹمنٹ نے مقامی آبادی میں محرومی کا احساس پیدا کیا۔ ان لوگوں کے پاس کوئی متبادل نہیں تھا جن کو دریاوں کے کناروں سے بے دخل کر کے ان سے ان کا رہن سہن چھین لیا گیا تھا۔ ریاست نے سماج کے روایتی طور پر پسماندہ طبقات، جیسے کہ نچلی ذات کے کاریگر، قبائل، خانہ بدوش قبائل جو بھیڑوں بکریوں پر انحصار کرتے ہیں، اور مختلف عقائد کے پیروکار گروہوں کو مرکزی دھارے میں لانے کی مؤثر کوششیں نہیں کیں۔

اعتماد کے فقدان کے خاتمے کی موجودہ کوششیں

تمام چیلنجز کے باوجود، پاکستانی سیاست اور معاشرہ ریاست اور شہریوں کے درمیان ایک متوازن عمرانی معاہدے کے حصول کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پاکستان کا 1973 کا آئین، جو آج بھی نافذ العمل ہے، اس مقصد کی طرف سب سے اہم کوشش کہا جاتا ہے۔ اس آئین کو اکثر وفاقی اکائیوں اور مختلف نسلی، سماجی، مذہبی اور اقتصادی طبقات کے نمائندوں کے درمیان واحد متفقہ معاہدہ قرار دیا جاتا ہے۔ یہ آئین مشرقی پاکستان کی علیحدگی اور 1971 میں بنگلہ دیش کے قیام کے بعد کے سیاسی اور جذباتی طور پر منقسم ماحول میں تشکیل دیا گیا تھا۔

وسیع سیاسی اتفاق رائے کے ساتھ تیار کیا گیا، یہ آئین مختلف سیاسی اور علاقائی مفادات کو مدنظر رکھتے ہوئے وفاقی پارلیمانی نظام قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے جس میں احتساب اور توازن کے عناصر شامل ہیں۔ تاہم، فوجی حکومتوں کے دوران آئین کی معطلی اور اس میں کی گئی متعدد ترامیم نے اس کی حقیقی روح پر سوالات کھڑے کیے کہ آیا یہ آئین اعتماد کے فقدان کو دور کر سکا ہے یا نہیں۔ قومی اسمبلی میں بلوچستان کے نمائندوں کو آئینی فریم ورک پر کئی تحفظات تھے، لیکن اُس وقت کی سول مارشل لا انتظامیہ نے انہیں پارلیمانی طریقہ کار کے تحت آئین کی منظوری کے حق میں ووٹ دینے پر مجبور کیا۔

عمرانی معاہدے کو از سر نو ترتیب دینے کی ایک اور بڑی کوشش اٹھارہویں آئینی ترمیم تھی، جو میثاقِ جمہوریت میں کیے گئے معاہدوں پر مبنی تھی۔ میثاقِ جمہوریت، جو 2006 میں پاکستان پیپلز پارٹی (پی پی پی) اور پاکستان مسلم لیگ-نواز (پی ایم ایل-ن) کے رہنماؤں نے دستخط کیا تھا، کا مقصد پارلیمانی حکمرانی کی بحالی اور سیاست میں فوج کے اثر و رسوخ کو کم کرنا تھا۔ اٹھارہویں آئینی ترمیم، جو 2010 میں نافذ ہوئی، نے 1973 کے آئینی ڈھانچے میں تبدیلیاں کیں۔ اس ترمیم کے ذریعے وفاقی حکومت سے صوبوں کو تعلیم، صحت، اور مقامی حکومتوں جیسے اہم اختیارات منتقل کیے گئے، جب کہ صدر کے کردار کو ایگزیکٹو سے ایک زیادہ ترعلامتی حیثیت میں تبدیل کیا گیا اور ایک مکمل پارلیمانی نظام کو بحال کیا گیا۔

2009 میں شروع کیے گئے آغاز حقوق بلوچستان پروگرام کا مقصد بلوچ عوام کے مسائل کو سیاسی نمائندگی، اقتصادی مواقع، اور ترقیاتی فنڈنگ کے ذریعے حل کرنا تھا۔ اسی طرح، فاٹا کو خیبر پختونخوا میں ضم کرنے اور گلگت بلتستان میں سیاسی اصلاحات کے ذریعے پسماندہ علاقوں کو قومی سیاست میں مکمل طور پر ضم کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ تاہم، ان اقدامات کو اکثر ان کے سست نفاذ اور بنیادی مسائل جیسے اعتماد کے فقدان کو پوری طرح سے حل نہ کرنے پر تنقید کا سامنا رہا۔

گزشتہ دہائی کے دوران، معلومات تک رسائی کے حق (آر ٹی آئی) اور عوامی خدمات کے حق جیسے قوانین نے ڈیجیٹل ٹیکنالوجیز کو اپنانے کے ساتھ پاکستان میں ریاست اور شہریوں کے درمیان تعلق کو مضبوط کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان قوانین اور ٹیکنالوجیز نے حکومت کی شفافیت، احتساب اور شہریوں کے لیے حکومت اور حکومتی خدمات تک رسائی کو بہتر بنایا ہے۔

پاکستان نے 2000ء کی دہائی کے اوائل میں معلومات کی آزادی کے قوانین متعارف کروانے میں جنوبی ایشیاء میں سبقت لی۔ 2010ء میں آئین کے بنیادی حقوق کے باب میں آر ٹی آئی کی شمولیت کے بعد، وفاق اور صوبوں نے اس قانون سازی کو اپ گریڈ کیا تاکہ معلومات تک رسائی کے حق کا ایک زیادہ کھلا اور شہری دوست فریم ورک متعارف کرایا جائے جس میں انفارمیشن کمیشنوں کے سامنے اپیل کا حق دیا گیا۔ شہری، بشمول صحافی، سول سوسائٹی، اور انفرادی کارکنان نے اس حق کو حکومت کے احتساب کے لئے اور معاشرے کے کمزور طبقات کی طرف سے مذاکرات کے لیے استعمال کیا۔

اسی طرح، خیبر پختونخوا میں عوامی خدمات کے حق کو باقاعدہ طور پر قانون بنایا گیا، جس کا مقصد ضروری خدمات کی فراہمی کو بہتر بنانا تھا۔ اس قانون نے خدمات کی فراہمی کے معیار کو قائم کیا اور اگر خدمات وعدے کے مطابق فراہم نہیں کی جاتیں تو شہریوں کے لیے ازالہ کے طریقہ کار فراہم کیے۔ گزشتہ چند سالوں میں، ڈیجیٹل ٹیکنالوجیز کے استعمال سے خدمات کی فراہمی بہتر ہوئی ہے۔ وفاقی اور صوبائی حکومتوں نے کئی ویب اور موبائل ایپلیکیشنز متعارف کرائی ہیں جن کے ذریعے شہری شکایات درج کروا سکتے ہیں، مستند معلومات حاصل کر سکتے ہیں، اور عوامی خدمات تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ ان حکومتی پورٹلز اور ڈیجیٹل پلیٹ فارمز نے شہریوں کو آسانی سے معلومات تک رسائی، درخواستیں جمع کرانے، اور حکومتی اداروں کے ساتھ تعامل کرنے کے قابل بنایا ہے، جس سے شہریوں کے لیے ریاست کے ساتھ رابطہ قائم کرنا اور حکمرانی کے عمل میں حصہ لینا آسان ہو گیا ہے۔

بین الاقوامی تجربات سے حاصل ہونے والے سبق

پاکستان میں ایک نئے عمرانی معاہدے کے لئے، ان بین الاقوامی مثالوں کو دیکھنا مفید ہو گا جہاں مُختلف اقوام نے کامیابی یا ناکامی کے ساتھ اسی قسم کے چیلنجز کا سامنا کیا۔ 1960 کی دہائی میں امریکہ میں شہری حقوق کی تحریک ایک کامیاب مثال پیش کرتی ہے کہ کیسے حقوق کے لئے مسلسل وکالت، قانونی اصلاحات، اور شمولیتی پالیسیاں ریاست اور شہریوں کے تعلقات میں نمایاں تبدیلیاں لا سکتی ہیں۔ جنوبی افریقہ میں نسل پرستی (اپارتھائیڈ) کے خاتمے اور نیلسن منڈیلا کی قیادت میں ایک جمہوری حکومت کے قیام کی مثال یہ واضح کرتی ہے کہ قانونی اور آئینی اصلاحات کی کس حد تک ضرورت ہوتی ہے تاکہ تاریخی ناانصافیوں کا ازالہ کیا جا سکے اور ایک جامع عمرانی معاہدہ تشکیل دیا جا سکے۔

روانڈا میں نسل کشی کے بعد کی مصالحتی کوششیں اس بات کی آگاہی فراہم کرتی ہیں کہ کس طرح مکالمے، انصاف، اور شمولیتی پالیسیوں کے ذریعے معاشرتی تقسیم کو مندمل کیا جا سکتا ہے۔ کمیونٹی کی سطح پر بنائی گئی عدالتوں (گاچاچا) کے قیام اور قومی اتحاد اور مصالحت کو فروغ دینے کی کوششیں ایک ٹوٹے ہوئے معاشرے میں اعتماد کی بحالی کے لئے اہم تھیں۔ جنوبی کوریا اور سنگاپور جیسے ممالک کی اقتصادی اور سیاسی تبدیلیاں حکمت عملی پر مبنی اصلاحات اور نمائندہ سیاست کی مثال دیتی ہیں۔ جنوبی کوریا کی فوجی حکمرانی سے مضبوط جمہوریت میں تبدیلی اور اس کے ساتھ ساتھ اس کی تیز رفتار اقتصادی ترقی ایک وسیع عوامی تحریک کے بغیر ممکن نہ ہوتی۔ دوسری طرف، وینزویلا، زمبابوے، اور کئی عرب ممالک میں عمرانی معاہدے کو از سر نو ترتیب دینے کی کوششیں بڑی حد تک ناکام رہی ہیں۔ مختلف سیاسی اصلاحات اور سماجی پروگراموں کے باوجود، وینزویلا کو شدید اقتصادی اور سیاسی بحران کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی طرح، زمبابوے کی کوششیں، جو اقتصادی بدانتظامی اور سیاسی جبر کے برسوں کے بعد اٹھائی گئیں، بھی ناکامی سے دوچار ہوئیں۔ 2008 کا سیاسی معاہدہ صدر رابرٹ موگابے اور اپوزیشن رہنما مورگن چانگیرائی کے درمیان سیاسی اور اقتصادی بحرانوں کا حل نکالنے کے لئے کیا گیا تھا، لیکن اس پر عمل درآمد کے مسائل نے اس کو مشکل میں ڈال دیا۔ بدعنوانی، اصلاحات کے لئے حقیقی سیاسی عزم کی کمی، اور اقتصادی چیلنجز اعلیٰ سطح پر کوششوں کے باوجود برقرار رہے۔

"عرب بہار"، جو 2010 کے آخر میں حکومت مخالف احتجاجی مظاہروں اور بغاوتوں کے ایک سلسلے کا نام تھا، کا مقصد بھی مختلف عرب ممالک میں طویل عرصے سے چلی آ رہے سیاسی جبر، اقتصادی مشکلات، اور بدعنوانی کو حل کرنا تھا۔ اگرچہ ابتدائی طور پر اس لہر سے عرب ممالک میں جمہوریت کے قیام کی امید ظاہر ہوئی، لیکن کئی ممالک میں اس کے نتائج ملے جلے یا مایوس کن رہے ہیں۔

"عرب بہار"، جو 2010 کے آخر میں حکومت مخالف احتجاجی مظاہروں اور بغاوتوں کے ایک سلسلے کا نام تھا، کا مقصد بھی مختلف عرب ممالک میں طویل عرصے سے چلی آرہے سیاسی جبر، اقتصادی مشکلات، اور بدعنوانی کو حل کرنا تھا۔ اگرچہ ابتدائی طور پر اس لہر سے عرب ممالک میں جمہوریت کے قیام کی امید ظاہر ہوئی، لیکن کئی ممالک میں اس کے نتائج ملے جلے یا مایوس کن رہے ہیں۔ مصر کا "عرب بہار" کا تجربہ بڑے پیمانے پر ہنگاموں کا سبب بنا، لیکن متوقع جمہوری استحکام حاصل نہ کر سکا۔ صدر حسنی مبارک کی ابتدائی برطرفی اور محمد مرسی کا انتخاب مثبت اقدامات سمجھے گئے تھے۔ تاہم، مرسی کی صدارت سیاسی انتشار کا شکار تھی، اور ان کی برطرفی کے بعد فوجی بغاوت نے عبدالفتاح السیسی کی حکومت کو جنم دیا۔ موجودہ حکومت کو آمرانہ رجحانات، اختلافات کی سختی سے دبانے، اور معنی خیز سیاسی اصلاحات کی کمی پر تنقید کا سامنا ہے۔

لیبیا میں، "عرب بہار" نے معمر قذافی کے اقتدار کا خاتمہ کیا، لیکن ملک شدید تقسیم اور جاری تنازعات سے دوچار ہے۔ قذافی کے خاتمے کے بعد پیدا ہونے والے اقتدار کے خلا نے متحارب ملیشیاؤں اور حریف حکومتوں کو جنم دیا۔ شام میں بغاوت جلد ہی ایک خونریز خانہ جنگی میں تبدیل ہو گئی، جس نے وسیع پیمانے پر تباہی اور انسانی بحران کو جنم دیا۔ یمن کی صورتحال بھی "عرب بہار" کے بعد مزید خراب ہو گئی۔ ابتدائی احتجاجوں کا سلسلہ صدر علی عبداللہ صالح کے استعفیٰ کا سبب بنا، لیکن اس کے بعد ہونے والی سیاسی منتقلی ملک کو مستحکم کرنے میں ناکام رہی۔ حوثی باغیوں کے عروج، جاری تنازعے، اور علاقائی طاقتوں کی مداخلت نے یمن کو ایک گہرے انسانی بحران میں دھکیل دیا ہے۔

پاکستان میں نئے عمرانی معاہدے کی تشکیل: اصلاحات کے لیے روڈمیپ

پاکستان میں ایک نیا عمرانی معاہدہ تشکیل دینے کے لیے وسیع تر مکالمے اور ایک جامع نقطہ نظر کی ضرورت ہے جو آئینی اور پالیسی سطح کی اصلاحات کو حل کرے، تاکہ معاشرے میں موجود تاریخی تقسیم اور موجودہ چیلنجز کا سامنا کیا جا سکے اور شہریوں اور ریاست کے درمیان عدم اعتماد کے فرق کو دور کیا جا سکے۔

وسائل کی تقسیم پر نظرثانی:

اگرچہ وفاقی اکائیوں کے درمیان وسائل کی تقسیم میں کچھ پیش رفت ہوئی ہے، لیکن صوبوں کے اندر نمایاں علاقائی تفاوت اب بھی برقرار ہے، کیونکہ صوبے مؤثر طریقے سے گورننس کے تیسرے درجے کی آئینی ضرورت سے بچتے رہے ہیں۔ صوبوں کے درمیان اتفاق رائے اس وقت تک بامعنی نہیں ہو گا جب تک کہ ہر صوبے کے مختلف گروہوں کو سنگین تحفظات لاحق رہیں گے۔ وسائل کی تقسیم کے فارمولے کو وفاقی اور صوبائی سطح پر اپ ڈیٹ کرنے کی ضرورت ہے۔ صوبوں کے اندر ناراض گروہوں اور ان لوگوں کو، جو روایتی اور سماجی طور پر پسماندہ ہیں جیسے کہ مذہبی اقلیتیں، نچلی ذاتیں، خانہ بدوش قبائل، اور مقامی گروہوں، کو ان نئے مذاکرات میں شامل کیا جانا چاہیے۔

سیاسی طاقت کی تقسیم:

مختلف گروہوں کے درمیان سیاسی طاقت کی تقسیم پر نظرثانی کی ضرورت ہے۔ حلقہ بندیوں کا تعین اس وقت آبادی کی بنیاد پر کیا جاتا ہے، جس نے کسی بھی صوبے کے لیے آبادی میں اضافہ کو ایک ترغیب میں بدل دیا ہے۔ 2017 کی مردم شماری کے بعد پنجاب کی قومی اسمبلی کی سات نشستیں کم ہوئیں جو خیبر پختونخوا اور بلوچستان کو مل گئیں، کیونکہ پنجاب کی آبادی کی شرح کے پی اور بلوچستان کی نسبت کم رہی۔ کسی بھی علاقے کی ترقی کا تعلق براہ راست اس کی کم آبادی کی شرح نمو سے ہوتا ہے، اور صرف آبادی پر مبنی حلقہ بندی نسبتاً ترقی یافتہ علاقوں کے لوگوں کی سیاسی طاقت کو کم کرتی ہے۔

کسی بھی علاقے کی ترقی کا تعلق براہ راست اس کی کم آبادی کی شرح نمو سے ہوتا ہے، اور صرف آبادی پر مبنی حلقہ بندی نسبتاً ترقی یافتہ علاقوں کے لوگوں کی سیاسی طاقت کو کم کرتی ہے۔

انتخابی نظام میں اصلاحات:

پاکستان کے انتخابی فریم ورک کو کئی بار اصلاحات کے باوجود تمام سیاسی کھلاڑیوں کا اعتماد حاصل نہیں ہوا، انتخابی اصلاحات کی آخری کوشش 2017 میں کی گئی۔ اس صورت حال کے پیش نظر، انتخابی فریم ورک میں موجود مسائل کی نشاندہی اور ان کے حل کے لیے ایک غیر روایتی نقطہ نظر اپنانا ضروری ہے جو مسلسل عدم استحکام اور رگڑوں کا باعث بن رہے ہیں۔ پاکستان کا موجودہ انتخابی نظام، جو فرسٹ پاسٹ دی پوسٹ سسٹم کے اصول پر مبنی ہے، اکثر ایک غیر متناسب نمائندگی کا نتیجہ ہوتا ہے جہاں ووٹ ہمیشہ قانون ساز نشستوں میں متناسب طور پر تبدیل نہیں ہوتے۔ یہ نظام بڑی سیاسی جماعتوں کو فائدہ دیتا ہے اور چھوٹی اور علاقائی جماعتوں کو پسماندہ کرتا ہے۔

ایک جائزے کے مطابق، پاکستان کا موجودہ انتخابی نظام اکثر پسماندہ اور علاقائی آوازوں کی مناسب نمائندگی میں ناکام رہتا ہے، جس کے نتیجے میں سیاسی محرومی میں اضافہ ہوتا ہے۔ جائزے کے مطابق، تناسبی نمائندگی یا مخلوط اراکین کے نظام جیسی اصلاحات شمولیت کو بہتر بنا سکتی ہیں اور کم نمائندگی والے طبقات کے لیے منصفانہ نمائندگی کو یقینی بنا سکتی ہیں۔ تاہم، ناقدین کا کہنا ہے کہ ایسی اصلاحات کو موجودہ نظام سے فائدہ اٹھانے والی سیاسی اشرافیہ کی طرف سے مزاحمت کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ اس کے علاوہ، یہ خوف بھی موجود ہے کہ تناسبی نمائندگی ٹوٹ پھوٹ والی اسمبلیوں یعنی جن میں کم نشستوں والی جماعتوں کی تعداد زیادہ ہو، کا سبب بن سکتی ہے جس سے مستحکم حکومتوں کی تشکیل مشکل ہو سکتی ہے اور اتحادی سیاست کے رُجحان میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ بہر حال، مستقبل کی کسی بھی اصلاحات کو انتخابی مسائل کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔

دیگر اہم اصلاحاتی شعبے

شہریوں اور ریاست کے درمیان اعتماد کے فرق کو ختم کرنے کے لیے، پالیسی سازوں اور قانون سازوں کو ریاست کو شہریوں کے لیے کھولنے اور آئین میں اصلاحات کا نیا پیکج متعارف کرانے کے لیے جراتمند اور تازہ خیالات کے لیے خود کو تیار کرنا چاہیے۔ وسائل اور سیاسی طاقت کی تقسیم اور حکومتوں اور نمائندوں کے انتخاب کے لیے اپ ڈیٹ کردہ قواعد پر اتفاق کرنے کے علاوہ، نئی اصلاحات کے سیٹ کو مندرجہ ذیل اہم شعبوں پر بھی توجہ دینی چاہیے:

عدالتی اصلاحات:

پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف لیجسلیٹو ڈویلپمنٹ اینڈ ٹرانسپیرنسی (PILDAT) کی 2021 کی رپورٹ کے مطابق، عدالتی عمل کی سست رفتار اور مقدمات پر زیادہ لاگت عوامی اعتماد اور انصاف تک رسائی کے حق کو مجروح کرتی ہے۔ سپریم کورٹ میں مقدمات کا بیک لاگ 50,000 سے تجاوز کر چکا ہے، اور آنے والے سالوں میں ان کے حل کی امید کم ہے۔ بھارت میں بھی عدلیہ کی حالت بہت خراب ہے۔ اگر عدلیہ میں بنیادی اصلاحات نہ کی گئیں، تو یہ مسئلہ مزید سنگین ہو سکتا ہے۔ موجودہ اصلاحات کی تجاویز میں قانونی طریقہ کار کو آسان بنانا اور مقدمات کو زیادہ مؤثر طریقے سے سنبھالنے کے لیے عدالتوں کی تعداد بڑھانا شامل ہے۔

سول سروس اصلاحات:

وفاقی اور صوبائی سطح پر ایگزیکٹو برانچز ایسی افسر شاہی کے تحت کام کرتی ہیں جو نوآبادیاتی ماڈل پر چلتی ہے۔ آخری اہم سول سروس اصلاحات 1973 میں کی گئی تھیں۔ تاہم، اس وقت کے بعد سے بہت کچھ بدل چکا ہے، اور ٹیکنالوجی نے گورننس کے طریقہ کار میں انقلاب برپا کیا ہے۔ آج، منتخب نمائندوں کی مدد کے لیے ماہر انتظامی کیڈرز کی ضرورت ہے تاکہ قوانین، ضوابط کو نافذ کیا جا سکے اور عوام کے لیے مؤثر گورننس کو آسان بنایا جا سکے۔ سول سروس اصلاحات ضروری ہیں تاکہ ملک کی سول سروسز میں 'سفید ہاتھی' اور 'سرخ ٹیپ' کے مسائل کو ختم کیا جا سکے۔

مقامی حکومتوں کو اختیار دینا:

مقامی حکومتوں کو اختیارات دینے کا نامکمل ایجنڈا مکمل کرنا ایک زیادہ شراکت داری والے ریاستی ڈھانچے کی تعمیر کے لیے ضروری ہے۔ 2017 کی ایک تحقیق کے مطابق، مقامی حکومتیں مقامی مسائل کو مرکزی حکام سے زیادہ مؤثر طریقے سے حل کر سکتی ہیں، جس سے بہتر گورننس اور عوامی خدمات کی فراہمی ممکن ہوتی ہے۔ اگرچہ مقامی حکومتوں کو اٹھارویں آئینی ترمیم میں آئینی تحفظ حاصل ہے، لیکن مقامی گورننس ابھی تک صوبوں کی ترجیحات میں نہیں آئی۔ مقامی حکومتوں کے انتخابات میں تاخیر، مقامی حکومتوں کی طاقتوں اور فرائض میں من مانی تبدیلیاں، مالی اختیار کی کمی، اور بہت سے دیگر مسائل صوبوں میں مقامی حکومت کی کارکردگی کو متاثر کرتے ہیں۔ پاکستان میں اگر تاریخی طور پر دیکھا جائے تو فوجی حکومتوں کے دوران مقامی حکومتوں کو زیادہ توجہ اور وسائل ملے ہیں۔ آئینی اصلاحات جو مقامی حکومتوں کو تحفظ فراہم کرتی ہیں ان میں انتخابات کے لیے دورانیہ فراہم کیا گیا ہے اور صوبائی حکومتوں کے من مانے کنٹرول کو کم کر کے، مستحکم اور مستقل مقامی حکومتوں کے قیام کو ممکن بنانے پر زور دیا گیا ہے جو عوامی خدمات کی فراہمی میں ایک مثبت تبدیلی کی علامت بن سکتی ہیں۔ ایسی اصلاحات کے عمل میں مقامی سطح پر ہونے والی بدعنوانی اور نااہلی کے خلاف حفاظتی تدابیر بھی فراہم کرنی چاہئیں۔

شہریوں کی شمولیت اور شرکت کو بڑھانا:

شہریوں کی شمولیت سے مراد وہ طریقہ کار اور میکانزم ہیں جو شہریوں کو اپنے خدشات کا اظہار کرنے اور اپنے نمائندوں کو جوابدہ بنانے کی اجازت دیتے ہیں، جس سے عوامی خدمات کے لیے ایک شہری مرکز، تعاون پر مبنی نقطہ نظر کو فروغ ملتا ہے۔ تاریخی طور پر، پاکستان میں ریاست نے اپنے گورننس کے کاموں کو انجام دیتے وقت شہریوں سے فاصلہ رکھا ہے۔ تاہم، ٹیکنالوجی میں ترقی اور عالمی اثرات نے بتدریج ریاست اور شہریوں کے درمیان زیادہ کھلا پن اور تعامل کو ممکن بنایا ہے۔ حالیہ ترقی کے باوجود، ریاست اور شہریوں کے درمیان رسمی رابطہ آج بھی غیر فعال ہے کیونکہ یہ حکومتی ڈھانچے میں جڑتا نہیں ہے۔ شہریوں کی شمولیت کو مزید فروغ دینے کے لیے، یہ ضروری ہے کہ آئین میں ایسا فریم ورک تیار کیا جائے جو شمولیت کے لیے رسمی طریقہ کار کی حوصلہ افزائی کرے۔ یہ فریم ورک صوبوں کو اس حوالے سے رہنمائی فراہم کرنے کے لیے ایک سیٹ آف گائیڈ لائنز کی صورت میں ہو سکتا ہے۔ ان مشاورتوں کے لیے واضح گائیڈ لائنز کے نفاذ کے ذریعے شفافیت کو بہتر بنا کر، ریاست زیادہ جوابدہی کو فروغ دے سکتی ہے۔